آرائش

حسّان احمد اعوان

آرائش

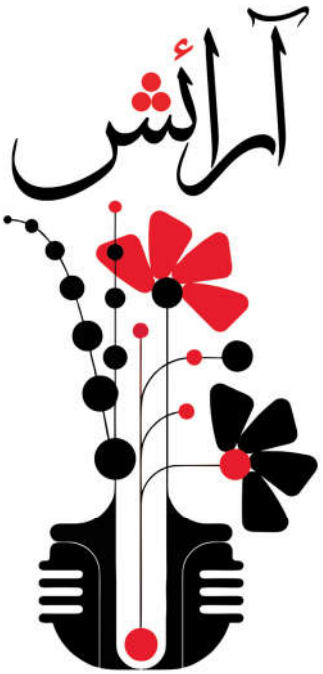

حسان احمد اعوان

حرف زاد پبلی کیشنز

اسلام آباد/ کراچی

03329422257

کتاب ایک کاغذی پیراہن ہی نہیں لیے ہوتی بل کہ اِس کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔کتاب افراد کی تربیت اور تعلیم میں جو اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔آج کا متمدن معاشرہ اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔کتاب ہی فرقہ واریت،علاقائیت اور قومیت جیسے محدود جذبوں سے ہٹ کر معاشرے میں انسان دوستی،بھائی چارہ اور روحانی قدروں کو جِلا بخشتی ہے۔

ضابطہ

سرنامہ	:	آرائش
معروض	:	غزل نوائی
نوامند	:	حسان احمد اعوان
سرورق	:	فیض محمد شیخ
تزئین	:	فیض محمد شیخ
اشاعتی شمارہ	:	اوّل
استحقاق	:	حقوق بحقِ شاعر محفوظ ہیں
منتظم	:	نوید فداستی
تعداد کتب	:	ایک ہزار
تقویمی حوالہ	:	اپریل دو ہزار اکیس
مبادلہ	:	پانچ سو روپے

انتساب

والد محترم
اور
والدہ محترمہ
کے نام

تسبیح

غزل اور آرائشِ حسانؔ — دیباچہ	علی صابر رضوی	۹
خودرو پھولوں والی پگڈنڈی	احمد حسین مجاہد	۲۴
لاکھوں باتوں کی ایک بات ہوئی	نعت	۲۸
کچھ عقل بھی رکھتا ہے جنوں زاد ہمارا		۳۰
دلوں میں بغض تھا سو بزم میں دھڑے ہوئے تھے		۳۲
لفظ خاموش ترازو سے نکل آیا ہے		۳۴
دورانِ ماہ و سال کے اندر نہیں ہوں میں		۳۶
آنکھ کے صحرا میں ایسا تیز پانی چھوڑ کر		۳۸
اُتر کے بحر میں کوئی گہر اُٹھا لیں گے		۴۰
دریا کی طرف دیکھ لو اک بار مرے یار		۴۲
ٹوٹا ہے کوئی خواب کہ جاگے ہیں خواب میں		۴۴
اُس حسنِ کم سخن سے مری بات چل پڑی		۴۶
خواب میں بھی در و دیوار سے ڈر جاتا ہوں		۴۸
سبز ہوتی ہوئی حسیں کوئی بیل		۵۰
عشق آزار کر دیا جائے		۵۲
اُس پری رو سے یوں کنارہ کیا		۵۴
کہہ چکے ہم ہزار بار تمھیں		۵۶
اشک کی ایسی فراوانی پہ رشک آتا ہے		۵۸
درد ثابت ہے سو انکار نہیں ہو سکتا		۵۹
روح تقدیر کے آرے پہ پڑی رہتی ہے		۶۰
ہر ایک شخص نے کاغذ پہ خواب اتارے جناب		۶۲
نفس کا درجو مرے اندروں بنایا گیا		۶۴

دل میں جو ہُوک اُٹھے کس سے بیاں ہوتی ہے ۶۶
آنے والے شعر پہ رائے باری باری بیٹھے گی ۶۸
اپنی قسمت کی جب خبر لوں گا ۷۰
ایسے کچھ لوگ بھی مٹی پہ اُتارے جائیں ۷۲
کہیں تو بس اک خیال سا ہے کہیں ہیں زندہ مثال چہرے ۷۳
میاں شعور کی دولت ہی کام لائی گئی ۷۴
مجھ میں اک خواب نے کل رات نمودار ی کی ۷۵
تہِ دربار خاموشی سرِ دربار خوشیاں ہیں ۷۶
میں جوڑتا ہوں مگر بار بار ٹوٹتے ہیں ۷۸
کچھ تو ایسے ہیں کہ جو پیار نہیں کرتے ہیں ۸۰
روح کاغذ، کلام خوشبو ہے ۸۲
آپ کے خواب سے بندھا ہوا ہوں ۸۴
شاعری کا حساب پیش کرو ۸۶
صاحب ہم کلام بیٹھے ہیں ۸۸
جزیہ کہ ترے عرش کو اِک زینہ لگایا ۹۰
سوچ میں کیسے کوئی ڈھنگ نیا آتا ہے ۹۲
اپنی پہچان کو میں کیا لایا ۹۴
گو کہ تجھ سے ادھار لی میں نے ۹۶
عشق کرتا ہوں اور کروں گا میں ۹۸
عشق کو مرحلہ سمجھتی ہو ۹۹
موسم گُل کا بھی حریف ہوا ۱۰۰
داد ملتی ہے تو سب بیش رقم بانٹتے ہیں ۱۰۱
چشمِ خواہش سے بھی کچھ حُسن شناسائی ہو ۱۰۲
میں پریشاں ہوں پریشانی نہیں ٹلتی ہے ۱۰۳
وجودِ خاک کبھی اتنا معتبر نہ رہے ۱۰۴

خون میں اشک ملانے سے نشہ ٹوٹتا ہے ۱۰۶

محبتوں کا ہماری طرف بہاؤ ہوا ۱۰۸

شعر ہوتا ہے کہ لفظوں سے دھواں اُٹھتا ہے ۱۰۹

کسی کا حُسن یہاں کیسا وار کر گزرا ۱۱۰

اس نے بخشے ہیں خد و خال مجھے ۱۱۲

آئنے پر ہو کیا یقیں مجھ کو ۱۱۴

ہجر اچھا وصال اچھا ہے ۱۱۶

یہ بدن ٹوٹ جائے گا اک دن ۱۱۸

تلاشِ حرف و معانی میں دم نکلتا ہے ۱۲۰

شرم کتنی ہے حجابوں سے پتا چلتا ہے ۱۲۲

ہاتھ وہ دل پہ رکھیں اور ترا کام نہ ہو ۱۲۳

پھیکی پڑی ہوئی ہے لکھائی صفات میں ۱۲۴

ہے مساوات کا پیام تمام ۱۲۶

دیکھ آسماں کے بعد تمھارا ہوا ہوں دوست ۱۲۷

میں یونہی کہاں دیدۂ حیران سے نکلا ۱۲۸

تیر سے اور کماں سے نفرت ہے ۱۳۰

دنیا والوں کی دنیا داری ہے ۱۳۲

شعر میں اپنا حال کہتا ہوں ۱۳۴

شام کی کہنہ روایات سے باہر نکلے ۱۳۶

آنکھ سے خون بہاؤ تو کہیں نکلے گی ۱۳۸

یہ دل میں اُتارا گیا سینے سے کما کر ۱۳۹

دکھ میں محرومِ آس تھوڑی ہیں ۱۴۰

عکس ہوتے ہی نہیں مجھ سے مری جان خط ۱۴۱

مری حیات محبت مرا مزار خوشی ۱۴۲

غزل اور آرائشِ حسان

علی صابر رضوی

حسن میرے نزدیک توازن، تناسب اور ترتیب کا نام ہے اور شاعری اس کی حسین ترین شکل ہے۔ شاعری ناگزیر لفظوں کے مترنم اور بلیغ استعمال کا نام ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں کے شعری ادب میں یہ مشترک قدر ہے۔ مشرقی بوطیقا میں قصیدہ اگر آدم ہے تو غزل اس کی پسلی سے نکلی ہوئی وہ حوا ہے جس نے اپنی وجودی حیثیت کو بہت جلد تسلیم کروالیا۔ عربوں نے غیر مردف اور ایرانیوں نے مردف غزل کو پروان چڑھایا پھر ہند ایرانی اور افغان حجازی تہذیبوں کے انضمام سے جس زبان و ادب کی بنا پڑی، تاریخ اسے اردو کے نام سے پہچانتی ہے۔ اردو بحرِ اوقیانوس سے بحرالکاہل کے مابین نشیب و فراز سے بھری جغرافیائی وحدت، ہزار ہا سال کی تاریخ اور ارتقائی عمل سے گزرتی تہذیبی جمالیات کی وراثت ہے۔

اردو زبان و ادب کی جمالیاتی اقدار کے فروغ میں ایک طرف بجھن ہے تو دوسری طرف آیت۔ ایک طرف گویے کا راگ ہے تو دوسری طرف طوائف کا تکلف۔ ایک طرف مجاہد کا لہجہ ہے تو دوسری طرف مٹیار کا نخرا۔ ایک طرف دربار کا جلال ہے تو دوسری طرف ممتا کا جمال۔ ایک طرف صوفی کی بشارت ہے تو دوسری طرف بچے کی کلکاریاں۔ یہ سب اور اس جیسے فطرت کے لامحدود اور لافانی رنگوں سے مزین احساسات اور کیفیات سے اردو کا لسانی دائرہ تشکیل پایا۔ اس دائرے میں غزل ہی وہ صنف ہے جس نے دیگر اصناف کی نسبت یہ اوصاف پوری کیمیت سے قبول کیے اور انھیں شعر کیا۔

غزل کو ولی سے میر تک اور غالب سے اقبال تک ہمیشہ ایسے اچھے لوگ ملے جو اسے فکری اور فنی زینوں سے بلندیوں پر لے گئے۔ ولی کی غزل ماخوذ، میر کی غزل مٹیار اور غالب کی غزل حور ہے۔ ولی نے فارسی شاعری کو معنی کے ساتھ اردو میں ڈھالا، میر و سودا نے فنی معنویت سے اس میں رنگ بھرے اور غالب نے فنی و فکری معنویت سے غزل کو عروج تک پہنچایا۔ میر دنیا کو

دنیا کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے ان کے یہاں دنیا کے سارے طبعیاتی رنگوں کی فراوانی ہے۔ غالب دنیا کو کرے سے نکل کر تیسری آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے ان کے یہاں کائنات کے مابعد الطبعیاتی جلووں کی بہتات ہے۔ میر کے یہاں فکر، فن کے ساتھ چلتی ہے لیکن غالب کے یہاں فن، فکر کے ساتھ چلتا ہے۔ میر کا ذہن کلاسیکی روایت کا امین تھا جبکہ غالب کا ذہن کلاسیکی روایت سے اگلے سفر پر گامزن تھا۔ میر کی معنوی اولاد ہونے کے بہت سے دعوے دار ہوئے لیکن کوئی بھی میر تک نہ پہنچا لیکن غالب کی خوش قسمتی کہ اقبال نے بیسیوں صدی میں غالب کو فنی جمالیات کے ساتھ دہرایا۔ مجموعی طور پر دونوں عظیم فنکار ہیں اور (شعرِ شور انگیز کے سارے شور کے باوجود) دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن سے اردو غزل ثروت مند ہوئی اور اسی نے فکر و فن کے گوشوں کو دنیا پر آشکار کیا۔ میر و غالب کو ان کے زمانے اور بعد کے زمانوں نے فنی اور فکری حوالوں سے اپنا پیشوا جانا اور ان کے اسلوب سے جزوی اکتساب کی کوشش کی۔ کلاسیکی عہد میں میر و غالب کے علاوہ سودا و انیس ایسے شاعر ہیں جن کی شعری جمالیات ان کے اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ قریباً ایک ہی ہے۔ چونکہ یہ لوگ فن کو مقدم رکھتے تھے اس لیے ان شعرا نے مجموعی طور پر شاعری کو متاثر کیا۔ جبکہ مصحفی و ذوق اور آتش و ناسخ نے زبان دانی کے حوالے سے جزوی طور پر اپنے اثرات چھوڑے۔ انکے بعد کے زمانے کے لوگوں نے ان کی اقتداء میں شعر کہنا باعثِ فخر سمجھا۔ حسانؔ احمد اعوان بھی انھی شعراء میں سے ایک ہے جو میر و غالب کو اپنا مربی سمجھتے ہیں۔ اس کے دو شعر اس کی مثال میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ہم قافیہ پیا نہیں شاعر ہوئے حسانؔ
اور میر تقی میر ہے اُستاد ہمارا

غالب کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ

پہلے تو فیض پایہ ہے غالب کے شعر سے
اب فیض یابِ عشق دوبارہ ہوا ہوں دوست

شعر میں میر و غالب کو پیشوا بنا کر سفر کا آغاز کرنے والا یہ نوجوان شاعر اگر ان شعراء کی شعریات

اور جمالیات کو جذب کرنے اور شعر میں بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گیا تو اردو غزل کو ایک اچھے شاعر کی بشارت دی جا سکتی ہے۔ اور یہ بشارت کسی خوش فہمی کی بنیاد پر نہیں بلکہ حسانؔ کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ، ابتذال سے پاک معاملہ بندی، لفظ کو مجازی معانی میں برتنے کی صلاحیت، عصری مسائل کو تاریخی اسطور سے جوڑنے کی کاوش، داخلیت کو خارجیت اور خارجیت کو داخلیت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کو دیکھتے ہوئے ہی دی جا رہی ہے۔ اور اس کی گواہی میں یہ اشعار دیکھ لیتے ہیں۔

خیموں سے ابھرنے لگیں ماتم کی صدائیں
اور ہم سے خفا ہو گیا سجاد ہمارا

اک پھول کے کھلنے سے بہت پہلے جہاں میں
اک خواب ہوا جاتا ہے برباد ہمارا

اُتر کے بحر میں کوئی گہر اُٹھا لیں گے
اور اُس کے بعد ہم اپنی نظر اُٹھا لیں گے

اُٹھا نہ بوجھ جو ہم سے بھی رفتگاں سے بھی
تو آنے والے اِسے کس قدر اُٹھا لیں گے

دونوں سکوت اوڑھ کے بیٹھے تھے اور پھر
اس چشمِ کم نما سے مساوات چل پڑی

پانی کے ساتھ بہتے گئے خواب و خواہشیں
دریا کے ساتھ دل کی مدارات چل پڑی

ویرانی گلشن پہ ہی مامور ہے موسم
مٹی سے نکلتے نہیں اشجار مرے یار

عجب قرینے سے تانا گیا زمیں پہ فلک
کوئی سہارا نہ کوئی ستوں بنایا گیا

میں ہوں اک آئنہ خانے میں سجایا ہوا عکس
اُس کی صورت مرے چہرے سے عیاں ہوتی ہے

اولیں موج کنارے سے پلٹ جاتی ہے اور
دوسری موج میں نے رنگ نیا ہوتا ہے

ایک پودے کے جیسا کام کیا
گل دیا اور بہار لی میں نے

سانس لینا مجھے محال ہوا
یار پانی سے اب نکال مجھے

مدھم سی خموشی مرے وجدان میں آئی
اور تیز اندھیرا مرے سامان سے نکلا

مشکل سے اٹھایا گیا اونچائی کی جانب
اک اور قدم آخری زینے سے کما کر

ان اشعار میں ایمائیت بھی ہے اور استعارہ بھی۔لیکن یہ سب کچھ مصرع سازی کی مشق سے ممکن ہوتا ہے۔حسانؔ کے یہاں مصرع سازی کی بھرپور صلاحیت ہے۔وہ جانتا ہے کہ جب تک

مصرع رطب و یابس سے پاک ہو کر ضرب المثل کی طرح اثر کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر لیتا، شعر کہنا کارِ لا حاصل ہے۔ ایک غزل اس حوالے سے دیکھتے ہیں جس کے مصرعے اس کی ریاضت کے گواہ ہیں۔

دلوں میں بغض تھا سو بزم میں دھڑے ہوئے تھے
ہم اپنے عہد کے پاتال میں پڑے ہوئے تھے

میں اونچا بولوں تو سانسیں اُکھڑنے لگتی تھیں
نفس کے تار کہیں حلق میں اڑے ہوئے تھے

مجھے تو غم کی نمو پر بھی رشک آتا ہے
کہ اس کے ساتھ مرے حوصلے بڑے ہوئے تھے

مری نظر میں کئی صورتیں تھیں دنیا کی
مرے بدن میں کئی آئنے جڑے ہوئے تھے

گرا ہوا تھا میں رستے میں لڑکھڑا کے کہیں
ذرا سے فاصلے پر لوگ بھی کھڑے ہوئے تھے

میں سانس سانس پہ غم کی چٹان کھینچتا تھا
اجل کے نیزے مرے سینے میں گڑے ہوئے تھے

جدید شاعری حسانؔ کیسے راس آتی
کہ ہم تو میر کے دیوان میں بڑے ہوئے تھے

مطلع عصری المیوں کا ادراک اور اس کی وجوہات کو بیان کرتا ہے۔ مطلع کا دوسرا مصرع ہمارے عہد کی پوری تصویر ہے۔ دوسرا شعر بتاتا ہے کہ انسان جب محبت چھوڑ کر اونچا بولتا ہے تو اس کا جسم بھی اس کے خلاف ردِعمل کرتا ہے۔ تیسرا شعر انسانی حیات میں غم کی کرداری اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ چوتھا شعر کلاسیکی روایت سے جڑا ہوا علامتی بیانیہ ہے جس میں دنیا کو جسمانی ضرورتوں سے جوڑ کر دیکھنے کی انسانی مجبوری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پانچوان اور چھیواں شعر انسان کی انسان سے دوری اور اپنی ذات کے دائرے میں قید ہونے پر تنقید کرتا ہے جبکہ مقطع میں شعری نظریہ بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان اشعار کی تعبیر و توجیح کئی اور حوالوں سے بھی کی جاسکتی ہے اور اگر آپ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں تو آپ بھی حسانؔ کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اور اگر آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے تو چند مصرعوں کی بنت سے حسانؔ کے ہاں امکانات کی روشنی محسوس کیجیے۔

ع: شعر ہوتا ہے کہ لفظوں سے دھواں اٹھتا ہے

ع: یہ ہجر ہے کہ خزانے سے ہاتھ اٹھتا ہے

ع: بات دیوار سے ہو کر بھی نکل جاتی ہے

ع: شور کرنے سے بات بنتی نہیں

ع: قوس کا آخری مقام ہے دل

ع: آئنہ دیکھ کے ہو جاتے ہیں اوسان خطا

ع: خدا بنے ہیں یہاں سب بشر بشر نہ رہے

ع: خون میں اشک ملانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

ع: آنکھ کو آنکھ پلائے تو نشہ باقی رہے

ع: کسی کے غم نے یہ بخیہ ادھیڑ ڈالا ہے

ان چند مصرعوں میں حسانؔ کی جمالیاتی اپج، تلازماتی ربط اور لفظ کو مجازی معانی میں برتنے کی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور شاعری میں یہی وہ لوازمات ہیں جو سنار اور نیارے کے

مابین خطِ فاصل کھینچتے ہیں۔حسانؔ سنار ہے جو جذبوں کو شکل دینے کا ہنر جانتا ہے۔اور جذبوں کو کیوں کر نہ شکل دے، اس کی شاعری کا خمیر محبت ہے۔اور محبت انسان کو تخلیق پر مجبور کر دیتی ہے۔حسانؔ جب اس کیفیت سے گزرتا ہے تو وہ بھی کہتا ہے کہ

لفظ ترتیب پا رہے ہوں گے
طبع پر میری شعر بھاری ہے

حسانؔ کی محبت وہ محبت جس سے سماج تشکیل پاتا ہے۔جس سے آگ گلزار ہوتی ہے۔جس سے انسان کی بخشش ہوتی ہے اور جو انسان کو حیات و ممات کی حقیقتوں سے آگاہ کر کے شکوہ کی بجائے صبر سکھاتی ہے۔حسانؔ کی شاعری سے چند اشعار دیکھتے ہیں جو اس کی معصومیت اور سچائی کو بیان کرتے ہیں۔

دو چار ہی الفاظ، محبت سے بھرے ہوں
تو دشت کو کر دیتے ہیں گلزار مرے یار

میں نے تمام عُمر محبت کمائی ہے
پلڑا یہ بھاری رکھے گی میرا حساب میں

میں محبت کروں گا اور اُس میں
ہجر آیا تو صبر کر لوں گا

تمام عُمر تجھے چاہتے رہے ہم لوگ
ہمیں تو ایک محبت ہی بس پڑھائی گئی

وہ دور تھا کہ محبت سے سب جڑے ہوئے تھے
اب ایسے لوگ نہیں ہیں اور اب ایسے گھر نہ رہے

مری حیات محبت مرا مزار خوشی
کسی نے کھینچ کے رکھ دی ہے آر پار خوشی

عصری شکست وریخت اور اقداری وتقدیری پابندیاں مسائل انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بچپن سے بلوغت تک انسان جن واقعات کو دیکھتا ہے یا بھوگتا ہے، اس کے شعوری اور لاشعوری ارتقاء کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس ذہنی کیفیت سے ہی انسان معاشرے کو دیکھتا اور ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔حسانؔ نے بھی فکر ونظر کا خام مواد اپنے آس پاس پھیلے ہوئے عصری مسائل سے لے کر انھیں شعر میں ڈھالا ہے۔ اور لائقِ داد بات یہ ہے کہ اس کے یہاں یاسیت یا قنوطیت نہیں، رجائیت ہے۔

یہ عہد کر لیا تھا کہ لائیں گے روشنی
تاریکیوں کی ضد میں اگر رات چل پڑی

کون کہتا ہے قلم سے نہیں ہوتی ہے سحر
بخدا ہوتی ہے اے تیرا شباں ہوتی ہے

دل کا اک کونا ہے جس کو ہم نے خالی چھوڑا ہے
شام کو واپس آ کر جس میں یاد تمھاری بیٹھے گی

بیج دنیا میں بو کے جاؤں گا میں
اور جنت میں اک شجر لوں گا

میں چھوڑ دوں گا یہ بت پرستی چلوں گا مسجد میں ساتھ زاہد
تو بس مرا ایک کام کر دے، کھنگال دل کو، نکال چہرے

پہلے اور دوسرے شعر میں شکوۂ ظلمتِ شب کرنے کی بجائے اپنے حصے کی شمع جلا کر صبحِ نو کا انتظار کرنے، تیسرے اور چوتھے شعر میں محبت سے شمر باری اور پانچویں شعر میں ریا سے پاک دلوں

کو دنیا و آخرت میں کامیابی کا یقین دکھائی دیتا ہے۔ مزید دو اشعار اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

آؤ گن لیتے ہیں اب اک دوسرے کے نیک کام
معتبر ہو جائیں گے ہم بدگمانی چھوڑ کر

بونے والوں کو مگر علم نہیں ہے اس کا
بغض کا پیڑ ثمر بار نہیں ہو سکتا

بدگمانی اور بغض کے پیڑ دیکھ کر مجھے مشہور انگریز شاعر (William Blake) ولیم بلیک یا د آ گئے۔ ان کی نظم ''زہریلا پیڑ'' (A Poison Tree) انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے پر مبنی ہے اس لیے حسانؔ کے اشعار کے تناظر میں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

I was angry with my friend;
I told my wrath,my wrath did end.
I was angry with my foe:
I told it not, my wrath did grow.

And I waterd it in fears,
Night & morning with tears.
And I sunned it with smiles,
And with soft deceitful wiles,

And it grew both day and night.
Till it bore an apple bright.
And my foe beheld it shine,
And he knew that it was mine,

And into my garden stole,

When the night had veild the pole;

In the morning glad I see

My foe outstretched beneath the tree

شعروادب کے تمام بزرگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ استعارہ یا مجاز بڑی شاعری کے لوازمات میں سے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہ سکتے ہیں کہ شاعری استعارے، مجاز مرسل اور کنایے کی مدد سے بڑی ہوتی ہے۔ ان سب کے پیچھے تشبیہ کھڑی ہوتی ہے۔ تشبیہ مماثلت اور مشترک خصوصیات پر ہوتی ہے اور مشترک خصوصیات کو دیکھنا اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کائنات کو ایک فنکار کی نظر سے دیکھے۔ یعنی استعارہ سازی کائنات کے مطالعے، مشاہدے اور اشیاء کی حسی، سمعی اور بصری مشابہتوں کو لفظی پیکر میں ڈھالنے سے ہی ممکن ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

ہمیں ہماری لچک ٹوٹنے نہیں دے گی
بڑھیں گے دوسری جانب جو یاں دباؤ ہوا

وہ نقش عجب نقش تھا جو خود دمِ تخلیق
یاقوت میں اُبھرا کبھی مرجان سے نکلا

اک پھول کے کھلنے سے بہت پہلے جہاں میں
اک خواب ہوا جاتا ہے برباد ہمارا
اِک سمندر کے سوکھ جانے سے
سات دریا اُداس تھوڑی ہیں

بات آغاز پھول سے ہو گی
بات کا اختتام خوشبو ہے

لفظ خاموش ترازو سے نکل آیا ہے
اور معنی بھی نیا ہو سے نکل آیا ہے

سوچ میری کبھی آزاد سفر کرتی تھی
اب تو زندان بکھیرو سے نکل آیا ہے

دل میں پیوست اگر ہو تو مزہ آ جائے
تیر جو حلقۂ اَبرو سے نکل آیا ہے

خاک سے خوشبوئیں نکلی تھیں سرِ دشت کبھی
اور اب پُھول بھی خوشبُو سے نکل آیا ہے

استعاراتی اسلوب اس بات کا اعلان ہے کہ لفظ کے معنی مجرد نہیں۔ امکانی حدوں تک معانی کا متشکل ہوتے رہنا اچھے شعر کی پہچان ہے۔ میر و غالب کے بہت سے اشعار آج بھی امکانی معانی پیدا کر رہے ہیں۔ یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے جب شاعر کو لفظ کو تخلیقی سطح پر برتنے کے لیے سیاق سباق بننے کا فن آ جاتا ہے۔ اسی تناظر میں حسان کی ایک غزل دیکھ لیتے ہیں۔

سبز ہوتی ہوئی حسیں کوئی بیل
یار ایسی یہاں نہیں کوئی بیل

شعر لگتے ہیں پھول کی صورت
یعنی ہوتی ہے ہر زمیں کوئی بیل

اس کے پھولوں کو پالتا ہوں میں
مجھ میں اُگتی ہے گر کہیں کوئی بیل

کیا ستم ہے کہ ایک مدت سے
اُگنے دیتی نہیں زمیں کوئی بیل

اُس کی خوشبو بیان کرتی ہے
کیسے بنتی ہے یاسمیں کوئی بیل

میری آنکھوں میں رقص کرتے ہیں
دلنشیں جسم جاں نشیں کوئی بیل

کوئی مالی ہے باغ میں حسانؔ
جس کی محبوب ہے یہیں کوئی بیل

میں اس بات کا قائل ہوں کہ متحرک ردیف معانی کے امکانات بڑھاتی ہے اور اس کے ساتھ اگر قافیہ بھی متحرک ہو جائے تو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ حسانؔ کی اس اس غزل میں بیل ایک غیر متحرک مادی پیکر ہے جس کے ساتھ کوئی نے اسے مجرد بنانے کی کوشش کی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس غزل کے ہر شعر میں بیل کوئی نیا معنوی پیکر تراشتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ شاعری ہے جو میرے اولین دعوے کی تصدیق کرنے کے لیے بطورِ شہادت پیش کی جاسکتی ہے اور حسانؔ اس پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ حسانؔ نوجوان ہے اور اس کے یہاں داخلی کیفیت بھرپور رچاؤ سے آئی ہے لیکن اس میں بھی اس نے رمز وایمائیت سے کام لیا ہے اور شعر کو مبتذل ہونے سے بچایا ہے۔

تُو مری نیند سی جڑی ہوئی ہے
میں ترے خواب سے بندھا ہوا ہوں

ہر تار میں تھے یار رواں خون کی صورت
احباب نے دل چیر کے تخمینہ لگایا

اِک درجۂ جمال سے کم تر نہیں ہے تو
اِک درجۂ کمال سے بڑھ کر نہیں ہوں میں

یہ کون جھانکتا ہے مرے دل میں بار بار
کس نے رکھا ہوا ہے مجھے اضطراب میں

حسانؔ کائناتی قضیوں کو بھی چھیڑتا ہے اور ان پر اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس نے بھی ایک عبد ہونے کے ناطے اپنے خالق سے راز و نیاز اور من و تو کیا ہے۔ اور خود کو رسالت ماب ﷺ کے حضور بھی بڑی عقیدت سے پیش کیا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ لگائیے۔

اک دائرے سے نکلا تو اک اور میں پھنسا
مرکز کے ان حدود سے ہٹ کر نہیں ہوں میں

مقتل سی فضا رہتی ہے اس ملک میں ہر دم
دیکھے ہیں مناظر کئی خوں بار مرے یار

حسنِ احمد ہی کا صدقہ ہے یہ حسنِ دنیا
حسن کی اتنی فراوانی پہ رشک آتا ہے

تیری رحمت ہی تو موضوعِ سخن رہتی ہے
ذکرِ توبہ یہ گنہگار نہیں کرتے ہیں

ان کی امت کا میں بھی حصہ ہوں
زندہ رکھتا ہے یہ خیال مجھے

نہیں مایوس اس کی رحمت سے
بخش دے گا وہ ذوالجلال مجھے

حسّان احمد اعوان نے ''آرائش'' میں اپنے اندر چھپے ہوئے شاعر کو دریافت کر لیا ہے۔ وہ شعر، غیر شعر، موزوں گوئی اور نعرہ بازی کے فرق سے واقف ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے لے کر رومانی تجربات تک اور مصرع کی بنت کاری سے لے کر فکری ترفع تک کی منازل اس نے بہت جلد طے کر لی ہیں۔ وہ شعر کہتے ہوئے کسی خاص فلسفے یا نظریے کی رو میں نہیں بہتا بلکہ اپنے آس پاس پھیلے ہوئے دنیا کے رنگوں کو جیسے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ویسے ہی شعر میں ڈھال دیتا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ آج جتنے اچھے شعر کہہ رہا ہے، تجریدی ذوق اور انجذابِ فن سے ایسے بڑے اشعار کی طرف جائے گا جو زمانی و مکانی حدود سے باہر نکل کر اپنے وجود کو تسلیم کرواتے ہیں۔ چند شعر پیش کرتا ہوں۔

عکس ہوتے ہی نہیں مجھ سے مری جان خطا
آئنہ دیکھ کے ہو جاتے ہیں اوسان خطا

میری آنکھوں میں ہی آنسو تھے نہ غمگین تھا وہ
ہاں بچھڑتے ہوئے دونوں نے اداکاری کی

خواب میں بھی در و دیوار سے ڈر جاتا ہوں
مَیں سکونت کے اِن آثار سے ڈر جاتا ہوں

کیا سے کیا راز مرے دل میں نہاں ہے لیکن
مسئلہ یہ ہے کہ اظہار سے ڈر جاتا ہوں

میں محبت کروں گا اور اُس میں
ہجر آیا تو صبر کر لوں گا

کتنی آزادی سے اب لوگ اُسے سوچتے ہیں
جب سے وہ فِکرِ مَن وتو سے نکل آیا ہے

میں نیا نغمہ ہوں مجھ کو طرزِ نو درکار ہے
گائیے مجھ کو مگر یہ دھن پرانی چھوڑ کر

حسانؔ احمد اعوان کے اس مجموعۂ کلام میں کلاسیکی اسلوب کے بہت سے اشعار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جڑیں روایت میں ہیں اور ہر وہ نوجوان جو روایت سے اپنا فن کشید کرتا ہے، اچھے شعر کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے یہاں جدت کے عناصر بھی جھلکتے ہیں۔ حسانؔ نے میر و غالب کی بوطیقا کی روشنی میں اگر شعر کو سنوارنے اور اپنے زمانے کے اساتذہ سے اکتساب کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ دن دور نہیں جب اس کے یہاں شعر ارتقائی عمل سے گزر کر فکر و فن کا مرقع بن جائے گا۔

خودرو پھولوں والی پگڈنڈی

احمد حسین مجاہد

ایبٹ آباد کے موسم کا کوئی ٹھیک نہیں، ابھی دھوپ نکلی ہوئی تھی تو اب جل تھل ایک ہو رہا ہے۔ گرم ملبوس تہہ کر کے سنبھالے ہی تھے کہ ٹھنڈ یانی اور گلیات کے پہاڑوں سے پھر سرد وسفید سندیسے آنے لگے اور کاغانی لوئی نکالتے ہی بنی۔ رات کو بازاروں میں پہرہ دینے والوں نے کنستر اور فقیر نے اپنی کانگڑی پھر سلگا لی۔ سرد ہوا اور دھوئیں نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو شہر کے بازار کو دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کی ہٹی یاد آنے لگی جو سردیوں میں سر شام ہی لپیٹ لی جاتی تھی۔ موسم اچانک بدل جائے تو اس کے ساتھ سمجھوتا کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک عجیب سی بے یقینی ہوتی ہے جو سارے میں پھیل جاتی ہے۔

پھر یوں ہوا کہ بے یقینی کی بکّل سے اعتبار کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ ہوا یوں کہ کچھ نوجوان سردی اور تاریکی سے بے نیاز، شہر کے ایک گوشے میں جمع ہونے لگے۔ احمد مشتاق نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا:

یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

ان نوجوانوں میں سے کسی کی پلکوں پر سے برف کے گالے اندر کی حدت سے پگھل کر ستاروں کی طرح چمکنے لگے تھے، کوئی اپنے خواب ہتھیلی پر لکھ کر لایا تھا، کسی کی آنکھوں سے نکلتے راستے پر ویرانی تھی اور کسی کے دل کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر خودرو پھول کھلے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے الاؤ روشن ہو گیا، کسی نے اس الاؤ کے کنارے اپنی نظمیں تو کسی نے غزلیں رکھ دیں۔ یہ سب کچھ میرے پڑوس میں ہو رہا تھا لیکن مجھے اس کی اطلاع اس وقت ملی جب اس الاؤ سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ چکوال کا حسانؔ احمد اعوان، مانسہرہ کا حسن علی، سکردو کا سلیم عباس اور کچھ دوسرے نوجوان یہ اڑتی چنگاریاں جمع کرتے رہے اور ایک شام وہاں

آن پہنچے جہاں ہم دوستوں کی سبھا جمتی تھی۔ بزمِ علم وفن (ہزارہ) کے مشاعروں میں ان تازہ دم شعرا کی شرکت نے واہ وا کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ شعر سننے سنانے کا مزا آنے لگا۔ اس دوران میں ان نوجوانوں نے اپنی یونی ورسٹی (کامسیٹس) میں بھی مشاعروں کا اہتمام کیا۔

دو چار مشاعروں کے بعد ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ حسانؔ احمد اعوان داد دینا ہی نہیں لینا بھی جانتا ہے لیکن حسانؔ کا نالہ، حسانؔ کا شعر سرور سے آگے کی چیز ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے اس کا ادراک بھی ہے۔ مجھے حسانؔ اور اس کی شاعری کے بارے میں جو کہنا تھا اس سادہ و معصوم سے جملے میں کہہ دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

حسانؔ کا شمار اُن محدود سے چند نوجوان شعرا میں ہوتا ہے جن کا خمیر اس مٹی سے اٹھایا گیا ہے جس میں تسلیم و رضا کا نم بھی ہے اور تحسین و اعتراف کی حرارت بھی۔ اس ضمن میں حسانؔ کا صرف ایک شعر درج کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

میری بیاض میں تو فقط چند شعر ہیں
ہر شعر انتخاب ہو آزرؔ نہیں ہوں میں

دلاور علی آزرؔ سے محبت کا اظہار بھی ہو گیا، آزرؔ کے کمالِ فن کی تحسین بھی ہو گئی، ایک ادا سے جس میں انکسار بھی ہے اور احساسِ تفاخر بھی، دشتِ سخن میں اپنی آمد کا اعلان بھی کر دیا۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن اس شعر میں ایک اور توجہ طلب اور نہایت اہم نکتہ بھی موجود ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے نئے لکھنے والے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے اور بہت دور کہیں جا کر انھیں احساس ہوتا ہے کہ صحیح راستے کا انتخاب کرنے میں ان سے کوتاہی ہو گئی ہے۔ حسانؔ کا معاملہ بڑا مختلف ہے کہ اس نے سفر کی ابتدا ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ اسے شعرا کے اس سلسلے سے منسلک ہونا ہے جو دلاور علی آزر سے ہوتا ہوا میرؔ سے جا ملتا ہے:

ہم قافیہ پیما نہیں شاعر ہوئے حسانؔ
اور میر تقی میرؔ ہے استاد ہمارا

جب شاعر کے ''آئیڈیلز'' معتبر ہوں اور وہ صاحبِ سلسلہ بھی ہو تو وہ گرمیِ بازار دیکھ کر بے

راہ روی کا شکار نہیں ہوتا۔ حسانؔ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسے اپنے امکانات کا ادراک کرنے میں تاخیر نہیں ہوئی۔ صاحبِ سلسلہ ہونے کا ایک اور بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کو ہزار سجدوں سے نجات مل جاتی ہے اور گھات میں بیٹھے ہوئے لات و منات اسے حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دوسری چیز جس کی طرف میں نے ابتدائے کلام میں اجمالاً اشارہ کیا تھا، قبولِ خاص و عام ہے۔ حسانؔ کے استاد میرؔ صاحب بھلے وقت یاد آئے:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس مقام پر تو خیر کوئی خوش قسمت شاعر ہی پہنچتا ہے اور وہ بھی ایک عمر کی ریاضت کے بعد لیکن کچھ قرائن تو ایسے ہونے چاہئیں جن کی بنا پر کم از کم یہ تو کہا جا سکے کہ شاعر اس مقام تک پہنچنے کا خواہاں تو ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قرائن شاعری ہی سے پھوٹتے ہیں، کبھی کسی مصرع یا شعر کی صورت میں اور کبھی کسی ایسے فنی التزام و اہتمام سے جس کا ایک عالی شان پس منظر بھی ہو۔ حسانؔ کا یہ شعر دیکھیے:

مری نظر میں کئی صورتیں تھیں دنیا کی
مرے بدن میں کئی آئنے جڑے ہوئے تھے

حسانؔ کے یہاں ہمیں کئی ایسے شواہد ملتے ہیں جو اس کے شاندار مستقبل کے غماز ہیں۔ وہ رفعتِ مضمون کی تلاش میں رہتا ہے اور اس عمر میں یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ نوجوان شعرا عموماً نظریہ فن جیسی چیز سے یا تو واقف نہیں ہوتے اور اگر ہوں تو اس کے بیان سے کتراتے رہتے ہیں۔ حسانؔ نے ایک نہیں کئی مقامات پر اپنا نظریہ فن بیان کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے معاصر کسی بھی اچھے شاعر سے کم نہیں۔

حسانؔ کے دو چار اشعار اور بھی دیکھ لیجیے:

کہ ساتھ ساتھ جو چلتے ہیں مل نہیں پاتے
تو ہم ہوئے کسی دریا کے دو کنارے جناب

اس شعر کا پہلا مصرع 'کہ' اور دوسرا 'تو' سے آغاز ہوتا ہے، اہلِ فن جانتے ہیں کہ یہ ہنر آتے آتے ہی آتا ہے۔

تھک جائیں گے چلتے چلتے منظر اپنی آنکھوں میں
رستے میں اک موڑ آئے گا اور سواری بیٹھے گی

میں محبت کروں گا اور اس میں
ہجر آیا تو صبر کر لوں گا

میرا ایمان ہے محبت پر
اور کافی ہے یہ یقیں مجھ کو

بس ایک شعر اور کہ اس شعر میں حسانؔ کی فطرت بول رہی ہے، وہ فطرت جسے محبت کے شفاف پانیوں میں گوندھا گیا ہے:

کچھ حسیں لوگ اس میں آن بسے
دل کی بستی کو جب ہزارہ کیا

'آرایش' حسانؔ کا نقشِ اول ہے جو کئی طرح کی خوبیوں کا مرقع ہے۔ میں نے حسانؔ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ شاعری سے کتنی محبت کرتا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ شعر کی محبت میں بہت دور تک جائے گا۔ ایبٹ آباد کے موسم کا کوئی ٹھیک نہیں لیکن شہر کے کسی گوشے میں حسانؔ ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی پلکوں پر جمی برف آہستہ آہستہ پگھل رہی ہے اور اس کے دل کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر خود رو پھول کھل رہے ہیں۔ غالبؔ سے معذرت کے ساتھ:

آرائشِ خیال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ حسانؔ کے ابھی

نعت

لاکھوں باتوں کی ایک بات ہوئی
مجھ سے میرے نبی کی نعت ہوئی

شہ نے دِکھلائی اپنی پیشانی
عمرِ جبریل کو بھی مات ہوئی

روئے انور سے دن ہوا پیدا
زُلف جب کُھل گئی تو رات ہوئی

نُور نکلا عرب کے صحرا سے
روشنی جس کی شش جہات ہوئی

میرے آقا نے خود ادا کی ہے
فرض ایسے نہیں صلٰوۃ ہوئی

نور اُن کا ازل سے تھا موجود
بعد ازاں خلق کائنات ہوئی

نام حسانؔ رکھ دیا گیا تھا
پس مری فِکر فِکرِ نعت ہوئی

○

کچھ عقل بھی رکھتا ہے جنوں زاد ہمارا
اب عشق میں پاگل نہیں فرہاد ہمارا

خیموں سے اُبھرنے لگیں ماتم کی صدائیں
اور ہم سے خفا ہو گیا سجاد ہمارا

اک پھول کے کھلنے سے بہت پہلے جہاں میں
اک خواب ہوا جاتا ہے برباد ہمارا

اک سوچ کہ محدود ہی رہتی ہے رہے گی
اک دل کا پرندہ ہے کہ آزاد ہمارا

ٹوٹے ہوئے دل سے بھی شکایت ہے ہمیں اب
رکھا نہ خیال اِس نے ترے بعد ہمارا

یہ بزمِ سخن ساز سخن ہی کی تگ و تاز
سُنتا ہے یہاں ہر کوئی ارشاد ہمارا

ہم قافیہ پیما نہیں شاعر ہوئے حسانؔ
اور میر تقی میر ہے اُستاد ہمارا

○

دلوں میں بغض تھا سو بزم میں دھڑے ہوئے تھے
ہم اپنے عہد کے پاتال میں پڑے ہوئے تھے

میں اونچا بولوں تو سانسیں اُکھڑنے لگتی تھیں
نفس کے تار کہیں حلق میں اڑے ہوئے تھے

مجھے تو غم کی نمو پر بھی رشک آتا ہے
کہ اس کے ساتھ مرے حوصلے بڑے ہوئے تھے

مری نظر میں کئی صورتیں تھیں دنیا کی
مرے بدن میں کئی آئینے جڑے ہوئے تھے

گرا ہوا تھا میں رستے میں لڑکھڑا کے کہیں
ذرا سے فاصلے پر لوگ بھی کھڑے ہوئے تھے

میں سانس سانس پہ غم کی چٹان کھینچتا تھا
اجل کے نیزے مرے سینے میں گڑے ہوئے تھے

جدید شاعری حسانؔ کیسے راس آتی
کہ ہم تو میر کے دیوان میں بڑے ہوئے تھے

○

لفظ خاموش ترازو سے نکل آیا ہے
اور معنیٰ بھی نیا ہُو سے نکل آیا ہے

سوچ میری کبھی آزاد سفر کرتی تھی
اب تو زندان پکھیرو سے نکل آیا ہے

کتنی آزادی سے اب لوگ اُسے سوچتے ہیں
جیسے وہ فِکرِ مَن و تو سے نکل آیا ہے

دل میں پیوست اگر ہو تو مزہ آ جائے
تیر جو حلقۂ اَبرو سے نکل آیا ہے

خاک سے خُوشبوئیں نکلی تھیں سرِ دشت کبھی
اور اب پُھول بھی خوشبُو سے نکل آیا ہے

تھوڑی محنت تو ہمیں کرنا پڑی ہے حسانؔ
یہ جو دریا سا لَبِ جو سے نکل آیا ہے

○

دورانِ ماہ و سال کے اندر نہیں ہوں میں
اب وقت ہوں کسی کو بھی اَزبر نہیں ہوں میں

اِک درجۂ جمال سے کم تَر نہیں ہے تو
اِک درجۂ کمال سے بڑھ کر نہیں ہوں میں

کیوں میری ناؤ غرق ہو آبِ حیات میں
کیوں مجھ پہ قہر ٹوٹے پیمبر نہیں ہوں میں

اِک دائرے سے نکلا تو اک اور میں پھنسا
مرکز کے اِن حدود سے ہٹ کر نہیں ہوں میں

میری متاعِ عمر مرے ساتھ جائے گی
میں ہوں فقیرِ عشق ، سکندر نہیں ہوں میں

میری بیاض میں تو فقط چند شعر ہیں
ہر شعر انتخاب ہو آزر نہیں ہوں میں

○

آنکھ کے صحرا میں ایسا تیز پانی چھوڑ کر
چل دیے ہو کس طرف یہ باغبانی چھوڑ کر

مکتبِ دنیا میں گوہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں لوگ
یہ خسارے میں ہیں نسخہ آسمانی چھوڑ کر

ہم جنوں زادے ہیں پابندِ زمانہ تو نہیں
جا کے تنہا بیٹھ جائیں گے کہانی چھوڑ کر

آؤ گن لیتے ہیں اب اک دوسرے کے نیک کام
معتبر ہو جائیں گے ہم بدگمانی چھوڑ کر

دل تو میرا ہے مگر اب اختیار اس پر نہیں
کام سب کرتا ہے میری ترجمانی چھوڑ کر

میں نیا نغمہ ہوں مجھ کو طرزِ نَو درکار ہے
گائیے مجھ کو مگر یہ دُھن پرانی چھوڑ کر

اب رواں ہے شاعری حسانؔ اپنی اس قدر
شعر کیسے ہو گا ہم سے یہ روانی چھوڑ کر

○

اُتر کے بحر میں کوئی گہر اُٹھا لیں گے
اور اُس کے بعد ہم اپنی نظر اُٹھا لیں گے

یہ ہجر جان کو آیا ہوا تو ہے لیکن
ہم آسمان کو سر پر اگر اُٹھا لیں گے

خموش رہ کے ہمیں زندگی گزارنی ہے
سکوت ٹوٹا تو کہرام سر اُٹھا لیں گے

میں تھک گیا ہوں بہت اپنی خاک ڈھو ڈھو کر
یہ بار آپ اُٹھائیں اگر اٹھا لیں گے

یہ طے ہوا ہے کہ رستے سے ہو سفر آغاز
کہ راستے ہی سے رختِ سفر اُٹھا لیں گے

اُٹھا نہ بوجھ جو ہم سے بھی رفتگان سے بھی
تو آنے والے اِسے کس قدر اُٹھا لیں گے

جو لوگ رکھتے ہیں رب سے دعا سلام اچھی
وہ رزق بانٹے تو اپنا ہنر اُٹھا لیں گے

○

دریا کی طرف دیکھ لو اک بار مرے یار
اک موج کہ کہتی ہے مرے یار مرے یار

ویرانیِ گلشن پہ ہی مامور ہے موسم
مٹی سے نکلتے نہیں اشجار مرے یار

کیا خاک کسی غیر پہ دل کو ہو بھروسا
اپنے بھی ہوئے جاتے ہیں اَغیار مرے یار

مقتل سی فضا رہتی ہے اس ملک میں ہر دم
دیکھے ہیں مناظر کئی خوں بار مرے یار

ہم خاک نشینوں کی یہاں کون سنے گا
اونچے ہیں بہت خواب کے دربار مرے یار

دیکھو یہ چلن ٹھیک نہیں عشق میں ہرگز
وعدے سے مُکر جاتے ہو ہر بار مرے یار

دو چار ہی الفاظ ، محبت سے بھرے ہوں
تو دشت کو کر دیتے ہیں گلزار مرے یار

حسانؔ بہت خوب تری مشقِ سخن ہے
ہر روز کہے جاتا ہے اشعار مرے یار

○

ٹوٹا ہے کوئی خواب کہ جاگے ہیں خواب میں
خواہش نمو کی لے گئی ہم کو سراب میں

یہ کون جھانکتا ہے مرے دل میں بار بار
کس نے رکھا ہوا ہے مجھے اضطراب میں

پڑھتے ہی اس کو اپنی طبیعت اُلجھ گئی
جاری یہ شعر کس نے کیا تھا نصاب میں

نالہ مرا سرور سے آگے کی چیز ہے
آواز میری آتی ہے چنگ و رباب میں

اِس دور میں بھی عشق اک ایسا سوال ہے
نفرت ہی آ رہی ہے برابر جواب میں

دنیا میں جل پری ہو تو جنت میں حور ہو
ہیں شیخ کے مطالبے کارِ ثواب میں

تخلیق ہوں میں ایسی کہ ثانی نہیں کوئی
ایسا ہی ذکر آیا ہے میرا کتاب میں

میں نے تمام عُمر محبت کمائی ہے
پلڑا یہ بھاری رکھے گی میرا حساب میں

○

اُس حسنِ کم سخن سے مری بات چل پڑی
بیٹھے بٹھائے خود ہی ملاقات چل پڑی

دونوں سکوت اوڑھ کے بیٹھے تھے اور پھر
اُس چشمِ کم نما سے مساوات چل پڑی

پوچھا جو میں نے آپ سے آتا ہے کون یاد
آنکھیں اُٹھائیں آپ نے برسات چل پڑی

ہر شخص کر رہا ہے یہاں اپنا انتخاب
فرقے بنے ہزار کہیں ذات چل پڑی

یہ عہد کر لیا تھا کہ لائیں گے روشنی
تاریکیوں کی ضد میں اگر رات چل پڑی

پانی کے ساتھ بہتے گئے خواب و خواہشیں
دریا کے ساتھ دل کی مدارات چل پڑی

حسانؔ میں نے جذب کو ڈھالا خیال میں
لفظوں کے انتخاب میں تورات چل پڑی

○

خواب میں بھی در و دیوار سے ڈر جاتا ہوں
مَیں سکونت کے اِن آثار سے ڈر جاتا ہوں

کیا سے کیا خواب مرے دل میں نہاں ہے لیکن
مسئلہ یہ ہے کہ اظہار سے ڈر جاتا ہوں

اور تو کچھ بھی مقابل ہو میں ڈٹ جاؤں مگر
اِک تری شوخیِ گُفتار سے ڈر جاتا ہوں

جس کی آواز فلک چیر ، خدا تک پہنچے
ایسے لاچار سے بیمار سے ڈر جاتا ہوں

جیت لیتا ہوں میں دل پھینک کے بازی اپنی
کون کہتا ہے کہ میں ہار سے ڈر جاتا ہوں

بوجھ پڑتا ہے طبیعت پہ خزاں دیکھوں تو
وَرق اُلٹے تو میں اخبار سے ڈر جاتا ہوں

وہ محبت ہو کہ ہو دشمنی کرتا نہیں میں
میں کہ حسانؔ ہر آزار سے ڈر جاتا ہوں

○

سبز ہوتی ہوئی حسیں کوئی بیل
یار ایسی یہاں نہیں کوئی بیل

شعر لگتے ہیں پھول کی صورت
یعنی ہوتی ہے ہر زمیں کوئی بیل

اس کے پھولوں کو پالتا ہوں میں
مجھ میں اُگتی ہے گر کہیں کوئی بیل

کیا ستم ہے کہ ایک مدت سے
اُگنے دیتی نہیں زمیں کوئی بیل

اُس کی خوشبو بیان کرتی ہے
کیسے بنتی ہے یاسمیں کوئی بیل

میری آنکھوں میں رقص کرتے ہیں
دلنشیں جسم جاں نشیں کوئی بیل

کوئی مالی ہے باغ میں حسانؔ
جس کی محبوب ہے یہیں کوئی بیل

○

عشق آزار کر دیا جائے
سب کو بیدار کر دیا جائے

ہو سکے تو حذف کہانی سے
میرا کردار کر دیا جائے

کر کے آباد ہجرِ یاراں میں
دل کو مختار کر دیا جائے

اِس طرف کے نہیں جو لوگ انہیں
اب کے اُس پار کر دیا جائے

دام دینے لگے جو مٹی کے
اُس کو انکار کر دیا جائے

آؤ نکلیں جنوں کے سائے سے
یہ نہ ہو وار کر دیا جائے

ایسے کچھ رہنما میسّر ہوں
نیک کردار کر دیا جائے

نیند آنکھوں تک آنے والی ہے
خواب تیّار کر دیا جائے

چاہتا ہوں کہ اب مجھے حسّان
مجھ سے بیزار کر دیا جائے

○

اُس پری رو سے یوں کنارہ کیا
خواب دیکھا نہ نقش اتارا کیا

اُس کو تجدید کی ضرورت تھی
آخری عشق کو دوبارہ کیا

تم نے بھی سرسری نگاہ رکھی
ہم نے بھی خواب میں نظارہ کیا

روح سرشار ہو گئی اپنی
عشق میں کون سا خسارہ کیا

اس نے چہرے پہ اک نظر ڈالی
اور مرے دل کو پارہ پارہ کیا

کچھ حسیں لوگ اس میں آن بسے
دل کی بستی کو جب ہزارہ کیا

کب زیادہ کی تھی ہوس حسانؔ
مل گیا جو بھی میں گزارا کیا

○

کہہ چکے ہم ہزار بار تمھیں
کس طرح بھول جائیں یار تمھیں

سارے آنسو پرو دیے اس میں
پیش کرتے ہیں اب یہ ہار تمھیں

اپنی رفتار کھینچ لیتے ہیں
خود سے کرتے ہیں ہم کنار تمھیں

مرتے جاتے ہیں چاہنے والے
یاد آئے گا پھر یہ پیار تمھیں

سوچتے رہنا ہاتھ ملتے ہوئے
کیوں کرایا نہ انتظار تمھیں

آپ کی ملکیت میں دیتے ہیں
اپنا دیوان اور مزار تمھیں

یہ کمائی ہے زندگی بھر کی
لو مبارک ہو عشق زار تمھیں

کسرِ نفسی کو کم کرو حسانؔ
مار ڈالے گا اِنکسار تمھیں

○

اشک کی ایسی فراوانی پہ رشک آتا ہے
چشمِ نم تیری پریشانی پہ رشک آتا ہے

جب کسی عالمِ حیرت کی خبر لگتی ہے
رشک آتا ہے جہاں بانی پہ رشک آتا ہے

تابشِ ماہ بھی کچھ کم تو نہیں ہے لیکن
یار کے چہرۂ نورانی پہ رشک آتا ہے

اوجِ افلاک پہ تنہائی کو لے آیا تھا
اس لیے کوچۂ ویرانی پہ رشک آتا ہے

حُسنِ احمدؐ کا ہی صدقہ ہے یہ حسنِ دنیا
حسن کی اِتنی فراوانی پہ رشک آتا ہے

○

درد ثابت ہے سو انکار نہیں ہو سکتا
دل کسی طور نم آثار نہیں ہو سکتا

بونے والوں کو مگر علم نہیں ہے اس کا
بغض کا پیڑ ثمر بار نہیں ہو سکتا

تم لگا لینا سبھی داؤ مگر یاد رہے
یہ جنوں زاد گرفتار نہیں ہو سکتا

وہ محبت ہو کہ نفرت کی کوئی صورت ہو
کوئی بھی کام لگاتار نہیں ہو سکتا

تُو ہی حاصل ہے مری سعیِ لاحاصل کا
تُجھ سے کم تو مرا معیار نہیں ہو سکتا

○

روح تقدیر کے آرے پہ پڑی رہتی ہے
سانس بھی جسم کنارے پہ پڑی رہتی ہے

شعر الہام نہیں ہوتا ہے ہر دم مُجھ کو
شاعری وقت کے دھارے پہ پڑی رہتی ہے

طول بیماری کو دیتی ہیں دوائیں ساری
اور صحت بھی گُزارے پہ پڑی رہتی ہے

یاد آتے ہو تو پھر اشک رواں ہوتے ہیں
اور مری آنکھ اِشارے پہ پڑی رہتی ہے

پہلے کچھ سال جوانی میں گزر جاتے ہیں
باقی کی عُمر سہارے پہ پڑی رہتی ہے

مجھ کو حسانؔ غزل دور سے یوں دیکھتی ہے
جیسے اِک آنکھ جو پیارے پہ پڑی رہتی ہے

○

ہر ایک شخص نے کاغذ پہ خواب اتارے جناب
کسی کسی سے بنے ہیں سخن کے پارے جناب

ابھی تو اپنے حوالے نہیں کیا خود کو
کسی کے ہونے لگے ہم ، تو ہم تمھارے جناب

ہمارا دل تو کسی ایک پر ہی آنا تھا
وہ ایک آپ ہیں اور آپ ہیں بھی پیارے جناب

ہمارے دل کے دریچے پہ اِک نظر کیجے
ادھر سے دیکھیے اُس پار کے نظارے جناب

کسی کسی کو تو الہام میں غزل اُتری
کسی کسی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے جناب

کہ ساتھ ساتھ جو چلتے ہیں مل نہیں پاتے
تو ہم ہوئے کسی دریا کے دو کنارے جناب

○

نفس کا در جو مرے اندروں بنایا گیا
اک اسم پھونکا گیا آبِ خوں بنایا گیا

ثمر ہمارا ہی بانٹا گیا زمانے میں
ہم ایسے پیڑ جنہیں سرنگوں بنایا گیا

جلائے عشق بھی ممکن ہوئی اسی کے طفیل
خدا کا شکر ہمارا جنوں بنایا گیا

عجب قرینے سے تانا گیا زمیں پہ فلک
کوئی سہارا نہ کوئی ستوں بنایا گیا

دراڑ ڈالی گئی ہجر سے تعلق میں
ہمارے حال کو ایسے زبوں بنایا گیا

بنایا جاتا مگر مجھ کو کس طرح حسانؔ
سو ایسے میری تمنا تھی ، یوں بنایا گیا

○

دل میں جو ہُوک اُٹھے کس سے بیاں ہوتی ہے
شاعری ہو کے بھی اب مجھ سے کہاں ہوتی ہے

میں ہوں اک آئنہ خانے میں سجایا ہوا عکس
اُس کی صورت مرے چہرے سے عیاں ہوتی ہے

صرف اک بار محبت ہو ضروری تو نہیں
دوسری بار بھی ہوتی ہے میاں ، ہوتی ہے

ایک خانہ ہے کہیں دل کے نہاں خانے میں
گریہ ہوتا ہے جہاں آہ و فغاں ہوتی ہے

کوئی بھی شے ہو جسے وقت کا پیکر مل جائے
دائمی ہوتی ہے وہ مثلِ زماں ہوتی ہے

کارِ تخلیق میں آتا ہے جو اک وقفہ سا
اس سے کچھ اور مری طبع رواں ہوتی ہے

کون کہتا ہے قلم سے نہیں ہوتی ہے سحر
بہ خدا ہوتی ہے اے تیرہ شباں ہوتی ہے

ہم ہیں مصروف فقط قافیہ پیمائی میں
زندگی میر کے شعروں میں بیاں ہوتی ہے

فرشِ رہ میں نے دل و چشم کیے ہیں حسانؔ
مجھ سے مل لے اُسے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے

○

آنے والے شعر پہ رائے باری باری بیٹھے گی
اب کے جو بھی نظم کہوں گا ذہن پہ ساری بیٹھے گی

اُس کے لیے پوشاک بناؤں گا میں اپنے ہاتھوں سے
رنگِ سپیدی بیچ میں ہو گا سُرخ کناری بیٹھے گی

کم گو ہیں اور اپنی عادت اپنی فکر پہ بھاری ہے
ورنہ جب بھی بات کریں گے دھاک ہماری بیٹھے گی

تھک جائیں گے چلتے چلتے منظر اپنی آنکھوں میں
رستے میں اک موڑ آئے گا اور سواری بیٹھی گی

دل کا اک کونا ہے جس کو ہم نے خالی چھوڑا ہے
شام کو واپس آ کر جس میں یاد تمھاری بیٹھے گی

شعر کی دنیا سے میں باہر نکلوں بھی تو کیوں نکلوں
نشہ جب اترے گا میرا میری خماری بیٹھے گی

رات کو جو بھی خواب میں دیکھا صبح وہی تعبیر کیا
اگلے روز بھی جاگنا ہو گا نیند بچاری بیٹھے گی

زیست ہماری تھک جائے گی ہجر کے لمبے رستے پر
اور ذرا سستانے کو بھی یہ دکھیاری بیٹھے گی

میرے بچاؤ کی تو میرے یار ہی کُچھ تدبیر کریں
آنکھ سے ضرب لگی ہے دل پر ضرب توکاری بیٹھے گی

○

اپنی قسمت کی جب خبر لوں گا
میں تجھے اپنے نام کر لوں گا

کتنی آوازیں اُٹھنے والی ہیں
اور میں کتنے کان دَھر لوں گا

میں محبت کروں گا اور اُس میں
ہجر آیا تو صبر کر لوں گا

مجھ کو آسان راستا نہ دِکھا
میں تو مُشکل کوئی سَفَر لوں گا

فن کو میں توڑ دوں گا حصّوں میں
اُس سے مرضی کا اِک ہُنر لوں گا

بیج دنیا میں بو کے جاؤں گا میں
اور جنت میں اِک شَجَر لوں گا

میں محبت بسانے آیا ہوں
میں تو ہر دل میں اپنا گھر لوں گا

میرے مالک مَیں بے ہُنر تو نہیں
کام دو گے تو کام کر لوں گا

اُس کا میرا حساب باقی ہے
تھوڑی تاخیر سے مگر لوں گا

جی رہا ہوں کہ جینا پڑتا ہے
مرنا پڑ جائے گا تو مر لوں گا

کون وعدہ نبھائے گا حسانؔ
اب بہت جلد میں مُکر لوں گا

○

ایسے کچھ لوگ بھی مٹی پہ اُتارے جائیں
دیکھ کر جن کو خدوخال سنوارے جائیں

ایک ہی وصل کی تاثیر رہے گی قائم
کون چاہے گا یہاں سال گزارے جائیں

آنکھ ہے تیری کہ صورت کوئی قوسین کی ہے
درمیاں آکے کہیں لوگ نہ مارے جائیں

ماہی اُس پار کھڑا آپ کی راہ تکتا ہے
آپ تعظیم کریں اور کنارے جائیں

روشنی چاہیے کچھ دیر ذرا اور ہمیں
چاند رُک جائے یہیں اور ستارے جائیں

○

کہیں تو بس اک خیال سا ہے کہیں ہیں زندہ مثال چہرے
کتابِ ہستی کے ہر ورق پر بکھر گئے لازوال چہرے

کہیں سراپا محبتیں ہیں ،کہیں ہیں جاں کا وبال چہرے
ہماری عظمت کی داستاں بھی ،ہمارے دل کا زوال چہرے

ہے کون ساقی یہ مے کہاں کی، کہاں سے جام و سبو ملے ہیں
جنابِ واعظ! کمال روحیں، جنابِ زاہد! کمال چہرے

شکار بے خود، کمان ساکت ہے اور شَل ہیں کسی کے بازو
شکاری خود اُن کے دام میں ہے غزال آنکھیں غزال چہرے

میں چھوڑ دوں گا یہ بت پرستی چلوں گا مسجد میں ساتھ زاہد
تُو بس مرا ایک کام کر دے، کھنگال دل کو ، نکال چہرے

○

میاں شعور کی دولت ہی کام لائی گئی
ضمیر بیچ کے دنیا نہیں کمائی گئی

خدا کا شکر مرے حوصلے جوان رہے
وگرنہ راہ میں دیوار تو اُٹھائی گئی

کسی کو جلوہ کسی کو وصال بخشا گیا
ہمارے دل کو حَسَد کی سزا سنائی گئی

پھر اُس کے بعد تو خوشبو نہیں لگائی کبھی
تمھارے لمس سے یوں دوستی نبھائی گئی

یہ ہجر ہے کہ خزانے سے ہاتھ اُٹھتا ہے
یہ تو گیا کہ مری عمر کی کمائی گئی

○

مجھ میں اک خواب نے کل رات نموداری کی
خاک کو بیج دیا اور شجر کاری کی

اس سے حاصل نہیں ہونا تھا اگر کچھ ہم کو
ہم نے کیا سوچ کے دنیا کی طرف داری کی

میں ہر اک بات سمجھتا ہوں زمانے سے الگ
مجھ کو برباد نہ کر دے یہ مری باریکی

میری آنکھوں میں ہی آنسو تھے نہ غمگین تھا وہ
ہاں بچھڑتے ہوئے دونوں نے اداکاری کی

خود ہی حسانؔ نے فطرت کی روانی کے سبب
شعر اپنا ہی کہا اپنی زمیں جاری کی

○

تہِ دربار خاموشی سرِ دربار خوشیاں ہیں
در و دیوار کی باتیں در و دیوار خوشیاں ہیں

تجھے تکنا تجھے سننا ترا ہنسنا مچل جانا
ہمارے غم کے آنگن میں فقط دو چار خوشیاں ہیں

ہزاروں داستانیں دفن سب یاروں کے سینے میں
کہیں تو غم ہے خوشیوں میں کہیں غم خوار خوشیاں ہیں

امیر شہر کیا جانے جو گزری ہے غریبوں پر
یہاں پر غم کے پھیرے ہیں وہاں ہر بار خوشیاں ہیں

خود اپنا مقصدِ تخلیق ہم جب تک نہ سمجھیں گے
جہاں میں جو میسر ہوں سبھی بیکار خوشیاں ہیں

بڑی محنت سے لکھی ہے سر قرطاس جو میں نے
کہانی میں جو رکھے ہیں سبھی کردار خوشیاں ہیں

جو مجھ پر شرط ہو حسانؔ پوری کر دکھاؤں گا
سر انکار گمنامی پس اقرار خوشیاں ہیں

○

میں جوڑتا ہوں مگر بار بار ٹوٹتے ہیں
بدن شکستہ ہے سانسوں کے تار ٹوٹتے ہیں

بکھرتی جاتی ہے مالا ہماری آنکھوں میں
اور اُس کے ساتھ ہی خوابوں کے ہار ٹوٹتے ہیں

دبائے پھرتے ہیں جو دل میں راز وحشت کے
بھرم اُنہی کے مگر میرے یار ٹوٹتے ہیں

ہمارے دل پہ غموں کی ہی حکمرانی ہے
یہاں پہ لطف مَرے ہیں ، قرار ٹوٹتے ہیں

وہ سیر کرنے کو آئیں کبھی جو گُلشن میں
سلام کے لیے پھر گُل ہزار ٹوٹتے ہیں

گلوں کو چھونے لگیں تو خیال رکھیے گا
حسین ہاتھوں میں پھولوں سے خار ٹوٹتے ہیں

ہمارے اشکوں کی اب آبرو بھی باقی نہیں
کہ یہ وہ موتی ہیں جو بے شمار ٹوٹتے ہیں

○

کچھ تو ایسے ہیں کہ جو پیار نہیں کرتے ہیں
ہائے وہ لوگ جو اظہار نہیں کرتے ہیں

غم کی زنجیر نے بچے کو یہ پیغام دیا
عشق کو صبر سے بیزار، نہیں کرتے ہیں

رُوبرو ہو کے کہیں بیٹھتے ہیں ہم دونوں
دیکھتے رہتے ہیں گفتار نہیں کرتے ہیں

بات دیوار سے ہو کر بھی نکل جاتی ہے
بات کو ہم پسِ دیوار نہیں کرتے ہیں

تم جو کہتے ہو کہ میں آئنہ دیکھوں جا کر
بات یوں صاحبِ کردار نہیں کرتے ہیں

یہ محبت تو وظیفہ ہے ہمارا ورنہ
کام کوئی بھی لگاتار نہیں کرتے ہیں

تم نصیحت پہ نصیحت ہی کیے جاتے ہو
یار ایسے کبھی غم خوار نہیں کرتے ہیں

تیری رحمت ہی تو موضوعِ سُخن رہتی ہے
ذکرِ توبہ یہ گنہگار نہیں کرتے ہیں

سامنے آتے ہیں بس اپنی کہانی لے کر
کچھ نیا کام اداکار نہیں کرتے ہیں

کامیابی سے بہت دور پڑے ہیں جو لوگ
نیند میں خواب کو بیدار نہیں کرتے ہیں

ہجر سے اس کو جلا ملتی ہے حسانؔ سو ہم
عشق میں وصل سے ہم وار نہیں کرتے ہیں

○

روح کاغذ ، کلام خوشبو ہے
کیا نمایاں پیام خوشبو ہے

ہے تمھارے خمیر کی خوشبو
تم جو کہتے ہو عام خوشبو ہے

ہم سے تحفے میں پھول کیوں کر لے
اُس کا تو اپنا نام خوشبو ہے

پھول موسم کی نذر ہو گئے سب
جس نے پایا دوام خوشبو ہے

کوئی میرے قریب آیا ہے
کیوں نہ بھیجوں سلام ، خوشبو ہے

نسبتیں آپؐ کے پسینے سے
کتنی عالی مقام خوشبو ہے

بات آغاز پھول سے ہو گی
بات کا اختتام خوشبو ہے

○

آپ کے خواب سے بندھا ہوا ہوں
عکسِ مہتاب سے بندھا ہوا ہوں

تُو مری نیند سی جڑی ہوئی ہے
میں ترے خواب سے بندھا ہوا ہوں

اس کی آنکھیں پکارتی ہیں مجھے
اور میں آداب سے بندھا ہوا ہوں

لیے پھرتی ہے دل کو موجِ ستم
غم کے سیلاب سے بندھا ہوا ہوں

غرق ہونا مرا مقدر ہے
ایسے گرداب سے بندھا ہوا ہوں

میرا ہر فعل ہے ترا پابند
میں کہ تجھ باب سے بندھا ہوا ہوں

تیری سنگت پہ ناز ہے حسانؔ
جیسے سُرخاب سے بندھا ہوا ہوں

○

شاعری کا حساب پیش کرو
تم بھی اپنی کتاب پیش کرو

بانٹی جائیں محبتیں کیسے
علمِ کارِ ثواب پیش کرو

تا کہ یکجائی آئے لوگوں میں
ایک جامع نصاب پیش کرو

کیوں گریزاں ہو بات کرنے سے
سب سوال وجواب پیش کرو

شور کرنے سے بات بنتی نہیں
شعر لکھو یا خواب پیش کرو

گر محبت ہے تم کو خلقت سے
ہر کسی کو گلاب پیش کرو

تم مصور ہو لاؤ فن اپنا
بر سرِ جوئے آب پیش کرو

○

صاحب ہم کلام بیٹھے ہیں
اور ساتھی تمام بیٹھے ہیں

اُن کو آداب کا پتا ہی نہیں
جو پے انتقام بیٹھے ہیں

یہ سفینہ ڈبوئے کون بھلا
جس میں اُن کے غلام بیٹھے میں

اپنی اچھی گزرنے والی ہے
ہم ترا لے کے نام بیٹھے ہیں

دل میں کچھ خاص لوگ ہیں موجود
ساتھ ہی کچھ عوام بیٹھے ہیں

ہم کسی طور اٹھنے والے نہیں
ہم بہ شرطِ دوام بیٹھے ہیں

کوئی مشکل مجھے نہیں درپیش
کیوں کہوں میرے کام بیٹھے ہیں

صبح ہم نے کیا سفر آغاز
ہو گئی اب تو شام بیٹھے ہیں

داد محفل میں آنے والوں کو
آپ کو بھی سلام، بیٹھے ہیں؟

○

جز یہ کہ ترے عرش کو اِک زینہ لگایا
اِس عمر کی دولت کو کہیں بھی نہ لگایا

ہر تار میں تھے یار رواں خون کی صورت
احباب نے دل چیر کے تخمینہ لگایا

اب خود کو بھی پہچان نہیں پاتا میں اکثر
حالانکہ ہر اک سمت ہے آئینہ لگایا

جب عشق جواں ہو گیا تب مجھ پہ کُھلا یہ
اک روگ تھا ، جو میں نے سرِ سینہ لگایا

یہ لوگ منافق ہیں یہ دل صاف نہیں ہیں
ہے بُغض رکھا اور کہیں کینہ لگایا

○

سوچ میں کیسے کوئی ڈھنگ نیا آتا ہے
دل کی دُنیا میں اگر رنگ نیا آتا ہے

اوّلیں موج کنارے سے پلٹ جاتی ہے اور
دوسری موج میں نیرنگ نیا آتا ہے

میں کہ دریا ہوں جہاں قحط پڑا ہو تو وہاں
میرے مُڑ جانے سے آہنگ نیا آتا ہے

کج نظر سوچ کو محدود کیے رکھتے ہیں
ایک ہٹتا ہے تو اک زَنگ نیا آتا ہے

کیسے ہوتی ہے زباں میں کوئی صورت پیدا
لفظ کیسے سرِ فَرہَنگ نیا آتا ہے

○

اپنی پہچان کو میں کیا لایا
دشت سے آئنہ اُٹھا لایا

موج سے دوستی رہی تھی مری
پانی ساحل تلک بہا لایا

شعر، مضمون اور خیال ہے بس
رزق اپنا تو میں کما لایا

ایک کوشش ضرور کی میں نے
اپنی طرزِ سُخن جدا لایا

جو اندھیرے کو چیر دیتا ہے
بُجھ گیا وہ دیا تو کیا لایا

ورنہ تو مانتا نہیں تھا وہ
بات دل کی اُسے بتا لایا

مجھ سے کم ظرف دوست پوچھتے ہیں
جز محبت تو اور کیا لایا

○

گو کہ تجھ سے ادھار لی میں نے
عمر اچھی گزار لی میں نے

اب اسے دور جا کے دیکھ ذرا
اپنی صورت نکھار لی میں نے

شاعری ڈوب جاتی پانی میں
وقت پر ہی نتھار لی میں نے

پہلے دو چار شعر اُترے تھے
اب غزل بھی اتار لی میں نے

کون لیتا ہے عاشقی میں سَنَد
مجھ کو تو دیکھ یار لی میں نے

اپنے حصے کے غم سہے اور یوں
دکھ کی لمبی قطار لی میں نے

راس آئی نہ یہ دوا مجھ کو
ہاں مگر بار بار لی میں نے

ایک پودے کے جیسا کام کیا
گُل دیا اور بہار لی میں نے

خود کو پہچاننے لگا حسانؔ
اپنی حالت سنوار لی میں نے

○

عشق کرتا ہوں اور کروں گا میں
خود کو مرنے سے روک لوں گا میں

زندگی چار دن کی لایا ہوں
پر یہاں دو ہی دن رہوں گا میں

تم مجھے دور سے کبھی دیکھو
چاند جیسا تمھیں دِکھوں گا میں

اِس سہولت پہ مجھ کو جانے دیا
وہ سمجھتا رہا رُکوں گا میں

شعر کہنے سے مجھ کو مت روکو
یا بتاؤ کہ کیا کروں گا میں

میں جو اتنا اداس ہوں سو آج
میر کی شاعری پڑھوں گا میں

تم بھی حسانؔ اپنا شعر کہو
دیکھنا جب غزل کہوں گا میں

○

عشق کو مرحلہ سمجھتی ہو
تم مرا مسئلہ سمجھتی ہو

صبر کرتا ہوں ہجر میں لیکن
تم اسے حوصلہ سمجھتی ہو

یہ کہانی کی ایک قسط ہے بس
تم جسے سلسلہ سمجھتی ہو

قوس کا آخری مقام ہے دل
کیوں اسے دائرہ سمجھتی ہو

عکس اُس میں اُترتے ہیں حسانؔ
خود کو وہ آئینہ سمجھتی ہو

○

موسم گُل کا بھی حریف ہوا
دل تمھارا بڑا نحیف ہوا

گُل نے پھر کِھل کے کچھ کہا ہو گا
آج موسم بہت لطیف ہوا

تجھ سے نسبت رہی تو پختہ تھا
اور تجھے بھول کر خفیف ہوا

آرزو مند کو دوام ملا
اور بے آرزو ضعیف ہوا

مُجھ میں شوقِ غزل ہوا پیدا
اور ترا نام یوں رَدیف ہوا

○

داد ملتی ہے تو سب بیش رقم بانٹتے ہیں
ہم تو الفاظ میں ان آنکھوں کا نم بانٹتے ہیں

ہم کو درپیش ہے اک معرکۂ تیرہ شبی
آؤ ہم روشنی کرتے ہیں قلم بانٹتے ہیں

بانٹنا ہے تو زرِ شوق ہی بانٹیں سب میں
بانٹنے والے بھی اس باب میں کم بانٹتے ہیں

ہم سے ملنا جو تمھیں حوصلہ درکار ہوا
بانٹتے آئے ہیں ہم لوگ ہی ہم بانٹتے ہیں

غم ضروری ہے زمانے میں بقا کی خاطر
اس لیے اہلِ عزا آج بھی غم بانٹتے ہیں

○

چشمِ خواہش سے بھی کچھ حُسن شناسائی ہو
کچھ تو اے جانِ غزَل دل کی پذیرائی ہو

تم کو تو آنکھ ملانا ہے ملاتے رہنا
کونسا میکدہ کھولا ہے کہ رسوائی ہو

بہتی خوشبو کا نیا لَمس سمجھ میں آیا
جوں صبا کوچۂ جاناں سے گزر آئی ہو

یہ جواب راکھ ہوئے جاتے ہیں یادوں کے چراغ
اِک سبب ہو بھی تو سکتا ہے کہ تنہائی ہو

کیوں نہ اب میری نظر دور کے جلوے دیکھے
تم مری جان ، مرا منبعِ بینائی ہو

○

میں پریشاں ہوں پریشانی نہیں ٹلتی ہے
ذہن پر نقش ہے ویرانی نہیں ٹلتی ہے

حسن ہے تیرا کہ بڑھتا ہے مری جانب کو
حسن ایسا کہ نگہبانی نہیں ٹلتی ہے

تُو جو کہتا تھا محبت کے بھی دو دن ہیں یہاں
ٹَل ہی جائے گی بلا ، جانی نہیں ٹلتی ہے

اپنے یاروں میں کوئی قدر شناس آیا نہیں
اس لیے اپنی فراوانی نہیں ٹلتی ہے

جب وہ آیا تو مری آنکھ نہ اُٹھی کیوں کر
اب تلک یار پشیمانی نہیں ٹلتی ہے

جب کبھی عالمِ خلوت میں مجھے یاد آؤ
محوِ حیرت ہوں کہ حیرانی نہیں ٹلتی ہے

آؤ حسانؔ کوئی راستا اپنائیں نیا
عمر بھر بے سروسامانی نہیں ٹلتی ہے

○

وجودِ خاک کبھی اتنا معتبر نہ رہے
خدا سے فاصلہ اس کا طویل اگر نہ رہے

ہمارے ساتھ میں رہنا ہے یا نہیں رہنا
تم ایک فیصلہ کر لو اگر مگر نہ رہے

مقام کھو دیے اپنے غرور میں آ کر
خدا بنے ہیں یہاں سب بشر ، بشر نہ رہے

نہ اتنے پاؤں پسارو کہ کم پڑے چادر
نہ اتنا بوجھ اُٹھاؤ کہ یہ کمر نہ رہے

کرے وہ جزبۂ دل کا رفیق اگر مجھ کو
میں ایک جست لگاؤں سفر ، سفر نہ رہے

یا مجھ کو جلوۂِ صد رنگ تک رسائی ملے
یا میری آنکھ چلی جائے اور نظر نہ رہے

وہ دور تھا کہ محبت سے سب جڑے ہوئے تھے
اب ایسے لوگ نہیں ہیں اور ایسے گھر نہ رہے

پُرانے دور میں سامان حرب تھا یہ سب
یہاں پہ تیر تھے بھالے تھے اور تبر ، نہ رہے

○

خون میں اشک ملانے سے نشہ ٹوٹتا ہے
اور پھر اس کو بہانے سے نشہ ٹُوٹتا ہے

شعر جس رنگ میں ہوتا ہے اسے ہونے دو
اس نئے اور پرانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

کوئی روٹھے تو منانے میں مزہ ہے صاحب
کون کہتا ہے ستانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

آنکھ کو آنکھ پِلائے تو نشہ باقی رہے
ہونٹ سے پیاس بُجھانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

بات کُچھ ایسی کہو جو کہ مرے دل پہ لگے
دوست اِس جھوٹے بہانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

خاک سے میری نئے جسم بناتے رہنا
چاک کو خالی گُھمانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

دھیمی لَو ہو تو مزہ آتا ہے جلنے میں مگر
لَو مگر اور بڑھانے سے نشہ ٹوٹتا ہے

○

محبتوں کا ہماری طرف بہاؤ ہوا
اداس چہروں سے اپنا بھی رکھ رکھاؤ ہوا

یہ سارے حُسن کے امیدوار تنگڑے ہیں
تو ووٹ کس کو پڑے گا اگر چناؤ ہوا

اب ان سبھی سے تو اپنی بلا کی یاری ہے
نمو کے خواب ہوئے یا بدن کا گھاؤ ہوا

ہمیں ہماری لچک ٹوٹنے نہیں دے گی
بڑھیں گے دوسری جانب جو یاں دباؤ ہوا

جو ایک کام کہا تھا ملے تھے جب پہلے
سو اَب ملے ہو دوبارہ تو کچھ بتاؤ ہوا

○

شعر ہوتا ہے کہ لفظوں سے دھواں اُٹھتا ہے
مصرعِ میر بھلا ہم سے کہاں اُٹھتا ہے

پہلے مصرع میں خلا رکھو تو پھر دوسرے پر
حرف آتا ہے کہیں لفظِ گماں اُٹھتا ہے

موت بھی آتی ہے یک بار جھپٹنے کے لیے
ایک ہی جست میں ہر پیر و جواں اُٹھتا ہے

نفرتیں وار کریں جس میں محبت تڑپے
ایسی ہر بزم سے بس یار دھواں اُٹھتا ہے

سطر در سطر کوئی بات نئی ہے حسّان
شعر سے پردۂ دل رازِ نہاں اُٹھتا ہے

○

کسی کا حُسن یہاں کیسا وار کر گزرا
بس ایک لمحے میں صدیاں گزار کر گزرا

وہ ایک دریا جو اترا ہے اک سمندر میں
وہ کیسے اپنی روانی کو مار کر گزرا

مجھے سمجھ ہی نہ آئی معاملہ کیا ہے
اگرچہ کرنا نہیں تھا میں پیار کر گزرا

وہاں پہ قتل ہوا اور قتلِ عام ہوا
جہاں جہاں سے وہ نظروں کو پار کر گزرا

تھا ایک ایسا پیمبر کہ اپنی ہستی سے
جو بدوؤں کو عرب میں سُدھار کر گزرا

کئی خیال مرے سامنے تھے پانی میں
میں شعر شعر سمندر نتھار کر گزرا

یہاں سے گزرا تو خوشبوئیں رقص کرنے لگیں
مری خزاں کو وہ پل میں بہار کر گزرا

حسانؔ گزرا ہے غم سے مگر یہ ثابت ہے
کہ اپنے سارے ہنر کو نِکھار کر گزرا

○

اس نے بخشے ہیں خد و خال مجھے
اور کیا چاہیے مثال مجھے

سانس لینا محال ہو گیا ہے
دل کے دریا سے اب نکال مجھے

بے خبر خُود سے ہو گیا ہُوں مَیں
ڈھونڈتا پھر رہا ہے حال مجھے

زندگی مَیں بکھر نہ جاؤں کہیں
یوں ہَوا میں تو مت اُچھال مجھے

اُنؐ کی اُمت کا میں بھی حصہ ہوں
زندہ رکھتا ہے یہ خیال مجھے

نہیں مایوس اُس کی رحمت سے
بخش دے گا وہ ذوالجلال مجھے

ہجر میں جل رہا ہوں مدت سے
کسی آتش فشاں میں ڈھال مجھے

○

آئنے پر ہو کیا یقیں مجھ کو
عکس پہچانتا نہیں مجھ کو

میں اگر گِر پڑا محبت میں
تھام لینا دلِ حزیں مجھ کو

میں نے اِس کو بہت سنوارا ہے
اب سنوارے گی یہ زمیں مجھ کو

میرا ایمان ہے محبت پر
اور کافی ہے یہ یقیں مجھ کو

دل میں تھوڑی سی تُم جگہ رکھنا
دفن کرنا یہیں کہیں مجھ کو

اپنی صورت پہ کیوں بنایا تھا
کوئی کہتا نہیں حسیں مجھ کو

پہلے حسانؔ نام تھا میرا
لوگ کہتے ہیں اب حزیں مجھ کو

○

ہجر اچھا وصال اچھا ہے
صرف اُس کا خیال اچھا ہے

ابتدا ہے نہ انتہا اچھی
عشق میں اعتدال اچھا ہے

کوئی صورت ہی بن رہی ہو گی
چہرۂ خد و خال اچھا ہے

کچھ نہ کچھ تو جواب آئے گا
کرتے رہیے سوال اچھا ہے

زندگانی اسیر کرنے کو
گیسوؤں کا یہ جال اچھا ہے

کیا زمانہ ہے یہ زمانہ بھی
اچھا بھی خال خال اچھا ہے

عاشقی کے عروج کو حسانؔ
اس انا پر زوال اچھا ہے

○

یہ بدن ٹوٹ جائے گا اک دن
غم مجھے بانٹ کھائے گا اک دن

یہ سمے روز کچھ دکھاتا ہے
آئینہ بھی دکھائے گا اِک دن

روز وہ مجھ کو چھوڑ جاتا ہے
اور پھر بُھول جائے گا اِک دن

حُسن معدوم ہو رہا ہے یہاں
عشق بھی ضَرب کھائے گا اِک دن

حُسن پر آپ ناز کرتے ہیں
دیکھنا گُل کِھلائے گا اِک دن

یہ سفر جس پہ ختم ہونا ہے
موڑ ایسا بھی آئے گا اِک دن

گِیت ہوں میں جسے پسند آیا
وہ مجھے گنگنائے گا اِک دن

جس سے پردہ اُٹھا رہا ہے یہ دل
پھر اسی کو چھپائے گا اِک دن

ظلم کا نام مٹنے والا ہے
عدل کا راج آئے گا اِک دن

تُجھ کو حسانؔ گھر ملیں گے بہت
تُو دِلوں میں سمائے گا اِک دن

○

تلاشِ حرف و معانی میں دم نکلتا ہے
بلا کی پیاس ہے پانی میں دم نکلتا ہے

کہیں تو سانس اتاری گئی کہانی میں
کہیں کہیں تو کہانی میں دم نکلتا ہے

نہیں ہے مصرعِ اولیٰ میں سانس لینے کا وقت
جبھی تو مصرعِ ثانی میں دم نکلتا ہے

نہ جانے خلق کو ہجرت کی کیوں پڑی ہوئی ہے
مرا تو نقل مکانی میں دم نکلتا ہے

تمھارے حُسن کی پہچان ہے یہ گال کا تل
ہمارا ایسی نشانی میں دم نکلتا ہے

عجیب بات ہے کہہ پا نہیں رہا تم سے
عجیب بات ہے پانی میں دم نکلتا ہے

مری تو زیست ازل سے ہے ایک غم کی امیں
اُس ایک غم کی روانی میں دم نکلتا ہے

کہیں وہ سانپ مجھے ڈس نہ لے یہاں آ کر
مرا تو رات کی رانی میں دم نکلتا ہے

○

شرم کتنی ہے حجابوں سے پتا چلتا ہے
شہر کے خانہ خرابوں سے پتا چلتا ہے

چند لمحے کسی بد خو کے علاقے میں رہے
آپ کے تُند جوابوں سے پتا چلتا ہے

میری تصویر صحیفوں سے عیاں ہوتی ہے
میرا شجرہ تو کتابوں سے پتا چلتا ہے

ملک میں کیا ہے تمدن ہمیں معلوم نہیں
جو تعصب ہے نصابوں سے پتا چلتا ہے

اِک بھی تعبیر میسر نہیں آئی یعنی
راز بکھرے ہوئے خوابوں سے پتا چلتا ہے

○

ہاتھ وہ دل پہ رکھیں اور ترا کام نہ ہو
ایسا ممکن ہی نہیں ہے تجھے آرام نہ ہو

روشنی ہوتے ہی غم بھی نہ عیاں ہونے لگے
صُبح گر ایسی ہے اے میرے خدا شام نہ ہو

میکدے جاتے نہیں آنکھ سے پی لیتے ہیں
ہم دعا کرتے ہیں اب اور کوئی جام نہ ہو

میں نے خط لے کے لفافے میں پڑا رہنے دیا
یہ تو سوچا نہیں ملنے کا ہی پیغام نہ ہو

سانس لینا اسے دشوار ہو دنیا کی طرح
تیرا حسانؔ کبھی ایسے تہِ دام نہ ہو

○

پھیکی پڑی ہوئی ہے لکھائی صفات میں
شاید گھلی نہیں تھی سیاہی دوات میں

مجھکو اسیرِ شعر و سُخن جانتے ہیں لوگ
یعنی کہ ایک قید ہے میری نجات میں

ہرنی جو گھر سے نکلی تو پھر نوچ لی گئی
کُچھ بھیڑیے قریب ہی بیٹھے تھے گھات میں

اک دل رُبا سا حُسن میسر تھا آنکھ کو
جیسے کوئی پَری ہو مجسم سوات میں

میں بات کر رہا ہوں تو سنتے ہیں سب مجھے
ظاہر ہے کوئی رمز تو ہے میری بات میں

حسانؔ کس نے مجھ میں اجالا کیا طلوع
مجھ کو چراغ دان کیا کس نے رات میں

○

ہے مساوات کا پیام تمام
کوئی آقا ہے یا غلام تمام

دل ہے تازہ اُڑان بھرنے کو
سوچ کا ہے یہیں قیام تمام

میں گیا اُس کا کام کرنے کو
کر دیا اُس نے میرا کام تمام

کر دیا ہے جنوں نے آوارہ
دشت پِھرتا رہا مُدام تمام

شاعری میں سند بتانے کو
ہے خُدائے سُخن کا نام تمام

○

دیکھ آسماں کے بعد تمھارا ہوا ہوں دوست
میں اک صحیفہ تم پہ اتارا ہوا ہوں دوست

ہے اس لیے بھی کشتی مری پانیوں کے بیچ
جیتے ہوئے خیال میں ہارا ہوا ہوں دوست

مجھ کو وفا کے درس سبھی یاد ہیں ابھی
تُو آزما کے دیکھ سُدھارا ہوا ہوں دوست

پہلے تو فیض پایہ ہے غالب کے شعر سے
اب فیض یابِ عشق دوبارہ ہوا ہوں دوست

ہیں زائچے میں خوبیاں ساری ، نجوم کی
کیا میں بھی آسماں کا ستارا ہوا ہوں دوست

○

میں یونہی کہاں دیدۂ حیران سے نکلا
اک راہ بناتے ہوئے امکان سے نکلا

تا عمر علاقہ رہا تجھ حسن سے مجھ کو
اک تیرا تعلق مرے دیوان سے نکلا

جھوٹی کوئی شہرت ہی مجھے راس نہ آئی
میں اِس لیے اِس حلقۂ پہچان سے نکلا

میں نے جو کہیں رکھا تھا اور بھول گیا میں
آخر کو وہی دل ، دلِ مہمان سے نکلا

ہاتھوں میں لیے سوچ میں گُم ہوں کہ سرِ دشت
یہ تار بھلا کیسے گریبان سے نکلا

وہ نقش عجب نقش تھا جو خود دمِ تخلیق
یاقوت میں دیکھا کبھی مرجان سے نکلا

مدھم سی خموشی مرے وجدان میں آئی
اور تیز اندھیرا مرے سامان سے نکلا

اِک بار مِلا جو بھی وہی بس گیا اس میں
یہ ظرف یقیناً دلِ حسانؔ سے نکلا

○

تیر سے اور کماں سے نفرت ہے
دشمنِ قلب و جاں سے نفرت ہے

میں بدلتا ہوں روز گھر اپنا
ایک دل اِک مکاں سے نفرت ہے

یہ محبت تو خود خدا سے ہے
سوچتا ہوں کہاں سے، نفرت ہے

ایک ہی بار لڑ کے مر جاؤں
روز کے امتحاں سے نفرت ہے

اپنے خالق سے پیار ہے مجھ کو
کب مجھے آسماں سے نفرت ہے

کیوں مرے ساتھ چل رہا ہے وہ
جس کو اس کارواں سے نفرت ہے

کچھ کو تو رفتگاں سے نفرت تھی
کُچھ کو آئندگاں سے نفرت ہے

○

دنیا والوں کی دنیا داری ہے
کاغذی رسم و راہ جاری ہے

لفظ ترتیب پا رہے ہوں گے
طبع پر میری شعر بھاری ہے

شعر پڑھنے لگے ہیں ہم جب سے
اپنی سانسوں پہ صوت طاری ہے

عاشقی میں سَنَد نہیں ہے میاں
شاعری ہی کا زخم کاری ہے

اِک صحیفہ ہے چہرۂ محبوب
اور مری آنکھ اُس کی قاری ہے

میں نے اِک ماہ رو سے عشق کیا
اُس نے مجھ پر غزل اُتاری ہے

زندگی اپنی کیا ہوئی حسانؔ
ہم پہ گزری نہیں گزاری ہے

○

شعر میں اپنا حال کہتا ہوں
اس ہنر کو کمال کہتا ہوں

جو مرے ذہن میں اُتر آئے
میں اُسی کو خیال کہتا ہوں

ہجر تو میرے ساتھ رہتا ہے
پر میں اس کو وصال کہتا ہوں

سُر نکلتے ہیں جب وہ بات کرے
اس کے لہجے کو تال کہتا ہوں

میں نے دیکھی ہیں اس کی شوخ آنکھیں
اس لیے تو غزال کہتا ہوں

پہلے میں خوب شعر کہتا تھا
اب تو بس خال خال کہتا ہوں

اس کے چہرے کو آئنہ حسانؔ
اس کی زلفوں کو جال کہتا ہوں

○

شام کی کہنہ روایات سے باہر نکلے
اُس سے کہہ دو کہ سیہ رات سے باہر نکلے

کوئی دھڑکن کی تگ و تاز بدل سکتا ہے
دل اگر خوابِ طلسمات سے باہر نکلے

اب ضروری ہے میاں عقل کے ناخن لینا
دل بھی اب عشق کے جذبات سے باہر نکلے

سات رنگوں کے لبادے میں چھپا ہے وہ شخص
کس طرح آٹھواں رنگ سات سے باہر نکلے

کس طرح چھوڑ دے دل غم کی نمو دنیا پر
کس طرح گریۂ سادات سے باہر نکلے

وقت نے آن لیا ان کو لپک کر حسانؔ
لوگ جتنے یہاں اوقات سے باہر نکلے

○

آنکھ سے خون بہاؤ تو کہیں نکلے گی
ورنہ یہ ہجر کی تلخی تو نہیں نکلے گی

میل کھاتا ہے ترا چہرہ بھی مہتاب کے ساتھ
آنکھ بھی تیری ستاروں سے قریں نکلے گی

اپنا لہجہ بھی نیا لاؤ نئے قافیے بھی
شعر بھی اپنا کہو گے تو زمیں نکلے گی

ایک عرصے سے ہی دونوں کی بڑی یاری ہے
روح اب جسم سے نکلی تو حزیں نکلے گی

دیکھ لینا کبھی حسانؔ اگر آنکھ کھلی
زندگی خواب جزیرے کی مکیں نکلے گی

○

یہ دل میں اُتارا گیا سینے سے کما کر
اِک زخم جو رکھا ہے قرینے سے کما کر

مشکل سے اٹھایا گیا اونچائی کی جانب
اِک اور قدم آخری زینے سے کما کر

اک گھر کا کرایہ بھی نہ پورا ہوا اُس سے
تنخواہ جو لایا تھا مہینے سے کما کر

احباب مرے ظرف پہ حیران ہوئے ہیں
لایا ہوں میں غم خون پسینے سے کما کر

ارمان تو دفنائے ہیں اس ہجر میں ہم نے
اور شعر اُٹھایا ہے دفینے سے کما کر

○

دکھ میں محرومِ آس تھوڑی ہیں
میرے سب شعر یاس تھوڑی ہیں

یہ جو پہنے ہیں قیمتی پوشاک
ان کے اپنے لباس تھوڑی ہیں

اُن کی یادیں ہیں اور میں ہوں بس
وہ مرے آس پاس تھوڑی ہیں

اِک سمندر کے سوکھ جانے سے
سات دریا ، اُداس تھوڑی ہیں

جتنے خود ساختہ ہیں یہ نقّاد
سارے غالب شناس تھوڑی ہیں

○

وہ قاعدہ جو عشق کا مجھ پر بیاں ہوا
اُس قاعدے میں حسن کا پیکر جواں ہوا

اک رات ہم پہ اُتری محبت کی چاندنی
وہ داستاں میں ڈھل گئی میں داستاں ہوا

آدم ہوں سارے کام، عمل مجھ سے پا گئے
لیکن میں ربِ کُن کا کہیں رازداں ہوا

پہلے سخن کا فہم ملا اور شعور بھی
پھر اس کے بعد لفظوں میں مصرع رواں ہوا

جس سے بھی ہیر پھیر ہوئی راہِ عشق میں
عبرت کا وہ نشانہ بنا بے نشاں ہوا

○

عکس ہوتے ہی نہیں مجھ سے مری جان خطا
آئنہ دیکھ کے ہو جاتے ہیں اوسان خطا

کتنی مشکل سے ہمیں ہوتا ہے پہلا مصرع
اور پھر مصرعِ ثانی میں تو اوزان خطا

چند احباب نے پھر حوصلہ بخشا ہے مجھے
ورنہ ہونے ہی لگا تھا یہ گریبان خطا

وہ بلاتے ہیں تو شہ خود ہی چلے آتے ہیں
ورنہ دربار میں ہو جاتے ہیں فرمان خطا

وہ بھی انساں تھے ہوئی جن سے خطا پہلے پہل
میں بھی انسان ہوں کرتے ہیں یہ انسان خطا

○

مری حیات محبت مرا مزار خوشی
کسی نے کھینچ کے رکھ دی ہے آر پار خوشی

کسی کے غم نے یہ بخیہ ادھیڑ ڈالا ہے
وگرنہ ایسے تو ملتی نہ مستعار خوشی

جب اُتھلے پانی میں مچھلی دکھائی دے جائے
تُو جال پھینک دے اور وقت پر نتھار خوشی

میں سوچتا ہوں کہ یہ شعر کیسے کہنا ہے
تو ذہن کہتا اک قافیہ اُتار خوشی

عجیب مرحلے آتے ہیں زیست میں حسّان
کہیں تو نقد بھی غم ہے کہیں ادھار خوشی

اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

(الرحمٰن)